حافظ عبدالغفور جہلمیؒ

تحریر:
مولانا محمد اسحاق بھٹی

حافظ عبدالغفور سے ملاقات کے اوّلیں نقوش افسوس ہے لوحِ ذہن پر محفوظ نہیں رہے۔ پہلے پہل ان سے کب ہاتھ جڑا اور کس وقت اور کہاں ان سے ہم کلام و ہم سلام ہونے کا آغاز ہوا، اس کی کوئی تصویر بار بار سوچنے اور دور تک نظر دوڑانے کے باوجود آنکھوں کے سامنے نہیں آ رہی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر اسے ذہن محفوظ نہیں رکھ سکا تو کیا مضائقہ ہے۔ بعض دفعہ انسان کو خود اپنا بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کن مشاغل میں گھرا ہوا ہے۔

حلیہ: بہرحال طویل عرصہ پیشتر جس حافظ عبدالغفور سے مجھے پہلی مرتبہ ہم کلامی کا موقع ملا ان کا اس وقت کا حلیہ کچھ اس قسم کا تھا۔ میانہ قد، صحت مند گداز جسم، سرخی مائل گندمی رنگ، کھلی پیشانی، جاذب نظر چہرہ، کشادہ سینہ، موٹی آنکھیں، چوڑے چہرے پر پھیلی ہوئی سیاہ شرعی داڑھی، لبوں پر مسکراہٹ کا غلبہ، بے تکلفانہ طرزِ گفتگو میں اپنایت کا مخلصانہ جذبہ، قمیص اور تہبند پہنے ہوئے۔ یہ ان کا بھری جوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد میل ملاپ اور باہمی بات چیت کا جو سلسلہ چلا اسے گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔

پھر آہستہ آہستہ زمانے کے رنگ بدلتے گئے اور وقت کی گاڑی اپنی فطری رفتار سے چلتی رہی تا آں کہ ان کی نوجوانی، جوانی میں بدلی، جوانی نے کہولت کا رخ کیا اور کہولت بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوئی اور جسمانی صحت پر کم زوری نے قبضہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی بالوں کی سیاہی نے سفیدی کا لبادہ اوڑھا اور داڑھی کی طوالت سینے تک پہنچی۔ سماعت نے ثقل سماعت کا آلہ آویزۂ گوش بنایا۔ جسم میں کسی حد تک موٹاپے کے آثار ابھرے اور تہبند کی جگہ شلوار نے لی۔ قد کاٹھ تو وہی رہنا تھا اور وہی رہا۔ طبعی خوش خلقی نے بھی ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اور آرام و تکلیف کے ہر موڑ پر ان کی رفاقت اختیار کیے رکھی اور ہر موقعے پر اپنے وجود کا ثبوت دیتی رہی۔

ولادت: اس ''خطبہ افتتاحیہ'' کے بعد اب آیے حافظ عبدالغفور کے متعلق مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے شروع سے آخر تک علمی و عملی واقعات خاص ترتیب کے ساتھ اپنے دائرۂ معلومات میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حافظ صاحب کے آباواجداد دراصل بستی اٹھوال جاگیر کے رہنے والے تھے۔ موجودہ جغرافیائی حساب سے یہ بستی ضلع اوکاڑہ کے ایک مشہور قصبے ''فتح پور'' کے قریب فیصل آباد اوکاڑہ روڈ پر واقع ہے۔ حافظ صاحب اسی بستی میں ۱۰۔ اپریل ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی محمد اسماعیل تھا جو اپنی نیک نامی کی وجہ سے گاؤں

میں اچھی شہرت کے مالک تھے۔

تعلیم اور اساتذہ: چھ سال کی عمر میں حافظ عبدالغفور نے گھر میں قرآنِ مجید پڑھا اور پھر انھیں پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری اس زمانے میں چار جماعتیں پاس کرنے کا نام تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے چوتھی جماعت کا وظیفے کا امتحان دیا امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے اور محکمہ تعلیم کی طرف سے وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ لیکن پرائمری پاس کرنے کے بعد حافظ عبدالغفور نے سرکاری سکول کی تعلیم ترک کر دی اور دینی تعلیم کے حصول کو اپنا شعار بنالیا۔ ان کے والد بھی یہی چاہتے تھے۔ دینی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۸ء کے قریب ضلع لائل پور کے ایک گاؤں ٹھٹھہ مینے کے چک نمبر ۱۵ میں میاں محمد کھرل سے کیا۔ وہاں قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور چند چھوٹی چھوٹی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے ضلع لائل پور ہی کے ایک اور گاؤں موضع ''عینو آنہ ساوے کا'' آئے۔ وہاں ایک چھوٹے سے مدرسے میں ایک بزرگ مولوی عبدالرحمٰن بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ان سے پورے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھیں۔ اب اس طرزِ تعلیم سے وہ کافی حد تک مانوس ہو گئے تھے اور اس کے آئندہ کے نشاناتِ راہ ان کے سامنے کچھ واضح ہونے لگے تھے۔

اس کے بعد وہ چک نمبر ۴۲۷ گ ب جھوک دادو (تحصیل تاندلیاں والا) چلے گئے۔ وہاں میاں محمد باقر مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں داخلہ لیا۔ کچھ عرصہ اس مدرسے میں میاں صاحب ممدوح کی شاگردی میں گزارا۔ پھر ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں ''دھیرداڈوگراں'' کا عزم کیا۔ وہاں مولانا عمرالدین مرحوم سے استفادہ کیا۔ دھیرداڈوگراں سے مدرسہ تعلیم الاسلام (اوڈاں والا ضلع لائل پور) کی راہ لی۔ پھر لکھو کے (ضلع فیروز پور) میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ لکھو کے اس زمانے میں پنجاب میں تدریس کا مشہور اور بڑا مرکز تھا، جہاں دور دراز سے شائقین علم آ کر تحصیل علم کرتے تھے اور وہاں کے فارغ علما کو مدارس دینیہ میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

تقسیم ملک سے پہلے میاں محمد باقر مرحوم نے اپنے مدرسے کے لیے مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور ان کا شہرۂ تدریس مختلف دینی درس گاہوں میں پہنچ گیا تھا۔ حافظ عبدالغفور نے جھوک دادو جا کر میاں محمد باقر کے علاوہ حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے بھی اخذ علم کیا۔ پھر حافظ عبداللہ صاحب وہاں سے اپنے وطن بڈھیمال گئے تو عبدالغفور استاذ کے پیچھے بڈھیمال پہنچ گئے اور کچھ عرصہ وہاں ان کے حلقہ درس میں

رہے۔ حصولِ علومِ دینیہ کے لیے حافظ عبدالغفور انتہائی سرگرم تھے۔ جہاں کسی لائق استاذ کے بارے میں تھوڑا بہت پتا چلا وہاں جا پہنچے۔ اس ضمن میں وہ دیہات میں بھی گئے اور قصبات و بلاد کے چکر بھی لگائے، جس سے جو کچھ ملا، لے لیا۔ گوجراں والا میں مولانا محمد چراغ مرحوم کی خدمت میں گئے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ راولپنڈی میں شیخ القرآن مولانا غلام اللہ مرحوم کے مدرسہ میں دورۂ تفسیر کیا۔

دارالعلوم تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) میں جن حضرات سے اکتسابِ فیض کیا وہ ہیں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی اور بعض دیگر اساتذۂ گرامی۔ سند فراغت اوڈاں والا سے لی۔ ان کے تمام عالی قدر اساتذہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔

ہم درس طلبا: اساتذہ کے بعد اب حافظ عبدالغفور کے ہم درس طلبا کی طرف آیے۔ یہ بڑی وسیع فہرست ہے، جس میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا محمد یعقوب ملہوی، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد صدیق لائل پوری، مولانا عبدالصمد رؤف، مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی اور حافظ محمد زکریا (ساکن جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب) شامل ہیں۔ فراغت کے بعد ان کے ہم درس حضرات نے بھی مختلف مقامات میں خدماتِ تدریس سرانجام دیں اور بعض نے خطابت میں نام پایا۔ بالآخر اپنی اپنی مدتِ حیات پوری کر کے یہ بھی دربارِ الٰہی میں جا پہنچے۔ یہ فقیر حافظ عبدالغفور کے اکثر اساتذہ کا بھی نیاز مند تھا اور ان کے مندرجہ بالا ہم جماعت حضرات سے بھی دوستانہ علائق رکھتا تھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

حافظ صاحب ممدوح کے ایک ہم جماعت ہمارے دوست مولانا عبدالقادر ندوی تھے۔ وہ ایک مدت سے جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کے منصب صدارت پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ انھیں صحت و عافیت سے رکھے اور وہ ہمیشہ اس کے دین کی خدمت میں مصروف رہیں۔

مختلف مقامات میں درس و تدریس: تحصیل علوم کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد حافظ عبدالغفور نے نئی عملی زندگی کا آغاز ایک کاروبار سے کیا۔ لیکن کاروبار کا سلسلہ ان کے ساتھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۰ء میں میاں محمد باقر ان کو مدرس کی حیثیت سے اپنے گاؤں (جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب) کے مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں لے گئے۔ ۱۹۵۳ء تک تقریباً تین سال وہ اس مدرسے میں مصروفِ تدریس رہے۔ اب انھوں نے تدریس کی خوش نما وادی میں داخل ہو کر خود کو مدرسین کی معزز برادری میں شامل کر لیا تھا اور محنت کر کے جلد ہی اس

برادری کے معروف رکن کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس کے نتیجے میں مدارس کے ارباب اہتمام بھی ان پر خوش تھے اور طلبا بھی ان کے طریق تدریس سے مطمئن تھے۔ وہ نہایت ذمہ داری سے زیر درس کتابوں کا مطالعہ کر کے یہ بنیادی فریضہ ادا کرتے تھے۔ عبدالغفور اسی مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں مصروف تدریس تھے کہ ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ لاہور میں پاکستان کی اسلامی حکومت نے مارشل لا نافذ کر دیا اور مرزائیت کی مخالفت اور نبی ﷺ کو خاتم النبیین قرار دینے والوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔ عبدالغفور کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور ان کے بعض شاگردوں کو بھی ان کے ساتھ ہی دھر لیا گیا۔ اب یہ لوگ منٹگمری (حال ساہی وال) جیل میں قید تھے۔ اسی جیل میں ان کے ایک شاگرد حافظ محمد سلیم قید تھے۔ ان کا جرم بھی یہی تھا کہ وہ مرزا قادیانی کو جھوٹا اور نبی ﷺ کو آخری نبی قرار دیتے تھے۔ مولانا عبدالغفور نے اس قید کو غنیمت جانا اور قرآن مجید یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ روزانہ جتنا قرآن مجید یاد کرتے تھے، اپنے شاگرد حافظ محمد سلیم کو سنا دیتے تھے۔ اس طرح ان کے یہ شاگرد ان کے استاد بھی تھے۔ صرف ۳۹ روز میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے ذہین تھے اور امور خیر میں کس قدر مستعد رہتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں جامع مسجد اہل حدیث راولپنڈی کے خطیب مولانا حافظ اسماعیل ذبیح مرحوم نے اپنی مسجد میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا عزم کیا تو وہ میاں محمد باقر مرحوم سے اجازت لے کر حافظ عبدالغفور کو اپنے اس نئے مدرسے میں لے گئے۔ مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کی خدمات بھی انھوں نے حاصل کر لی تھیں۔ حافظ اسماعیل ذبیح نے اس مدرسے کا نام مدرسہ تدریس القرآن والحدیث رکھا تھا۔ حافظ عبدالغفور اس مدرسے میں دو برس مدرس رہے۔ وہ مدرس کے علاوہ بہت اچھے خطیب بھی تھے، چناں چہ اس اثنا میں وہ راولپنڈی کی مسجد اہل حدیث (چک بازار صدر) میں فریضہ خطابت بھی انجام دیتے رہے۔

۱۹۵۶ء میں میاں محمد باقر انھیں راولپنڈی سے تاندلیاں والا لے آئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میاں صاحب نے اپنے گاؤں کے مدرسے کا کچھ حصہ منڈی تاندلیاں والا میں منتقل کر دیا تھا اور اس سلسلے میں حافظ عبدالغفور کی خدمات حاصل کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ چنانچہ اب حافظ صاحب تاندلیاں والا کے مدرسے کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ لیکن یہاں وہ صرف دو سال (۱۹۵۸ء تک) رہے۔

تاندلیاں والا سے حافظ عبدالغفور کو پھر نقل مکانی کرنا پڑی۔ چند لفظی شرح اس متن کی یہ ہے کہ کئی سال سے جہلم میں اس دور کے مشہور عالم مولانا عبدالمجید دینانگری خطابتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ چھوٹا سا

مدرسہ بھی انھوں نے مسجد میں جاری کر رکھا تھا جس میں محدود تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن جب وہ کبر سنی کو پہنچ گئے اور جسمانی کمزوری کا شکار ہوگئے تو انھوں نے جہلم کی جماعت اہل حدیث کے مشورے سے حافظ عبدالغور سے رابطہ قائم کیا اور میاں محمد باقر مرحوم سے ملاقات کی اور جہلم کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت وامامت اور درسِ قرآن کے لیے حافظ عبدالغفور کی خدمات حاصل کرلیں۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکا، اس لیے کہ حافظ صاحب ممدوح بہ طور مدرس کام کرنا چاہتے تھے اور طلبا کو پڑھانا انھوں نے اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا تھا، جب کہ جہلم میں اس وقت یہ صورت حال نہ تھی، وہاں صرف خطابت وامامت اور صبح کا درس قرآن تھا، لہٰذا جہلم کی جماعت سے معذرت کر کے حافظ صاحب لائل پور (فیصل آباد) آ گئے اور ۱۹۵۹ء میں جامعہ سلفیہ کی مجلس انتظامیہ نے بہ طور مدرس ان کی تقرری جامعہ سلفیہ میں کر دی۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کی زمامِ اہتمام مولانا محمد اسحاق چیمہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی اور مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جامعہ کی مسند درس پر فائز تھے۔ حافظ عبدالغفور تین برس (۱۹۶۱ء تک) جامعہ سلفیہ میں خدمت تدریس پر مامور رہے۔

کامیاب مدرس: حافظ عبدالغفور کے مختلف اوقات میں مختلف مقامات میں نقل وحرکت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کہیں جم کر بیٹھ نہیں سکے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدریس کے دورِ ابتدا ہی سے انھیں محنت اور لگن سے پڑھانے کی عادت پڑ گئی تھی، جس سے مدارس کے اصحابِ انتظام بھی متاثر تھے اور طلبا بھی ان کے اندازِ تدریس سے خوش تھے، چنانچہ جھوک دادو کے مدرسے سے لے کر لائل پور کی جامعہ سلفیہ اور راول پنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث تک کے منتظمین اور طلبا پر ان کا اثر تھا اور ہر چھوٹے بڑے، تدریسی ادارے میں ان کی مانگ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ حافظ صاحب ان کے ہاں خدمت تدریس انجام دیں۔ یہ کسی مدرس کا بہت بڑا اعزاز ہے جو تدریس کے ابتدائی دور میں اسے حاصل ہو جائے۔ اور حافظ عبدالغفور کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس میں ان کی طلب بڑھ گئی۔

جہلم کی جماعتی تاریخ ایک نظر میں: ابھی بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک حافظ عبدالغفور جامعہ سلفیہ (لائل پور) میں قیام فرما رہے۔ اب ۱۹۶۲ء شروع ہو جاتا ہے اور ان کا مختلف مدارس میں آنے جانے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ جہلم کی جماعت کے معزز ارکان کا ایک وفد جامعہ سلفیہ کے اصحابِ انتظام

سے گفتگو کر کے انھیں جہلم لے آتا ہے اور وہ مستقل طور سے اس شہر کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں اور اپنی خدمات یہاں کے مکینوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور جہلمیوں کے ساتھ خود بھی جہلمی ہو جاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جہلم کی جماعت اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اور اس کے دورِ ماضی نے بہت سی اہم شخصیات کو یہاں احترام کا مقام دیا ہے، جس کا مختصر الفاظ میں یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

بہت عرصہ پیشتر یہاں ایک بزرگ میاں نعمان فروکش تھے، جو مسجد اہل حدیث میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے اس شہر میں حالات کے مطابق توحید وسنت کی خوب تبلیغ کی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولوی سلطان محمود نے ان کی مسند سنبھالی اور اشاعت توحید کے لیے کوشاں ہوئے۔ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو کوٹلہ ائمہ (جہلم) کے ایک اہل حدیث بزرگ مولوی احمد علی ان کی جگہ پر آئے اور مسجد کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت امامت کا فریضہ میاں نعمان کے بیٹے میاں عبدالعزیز انجام دیتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں (آرہ صوبہ بہار میں) آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پنجاب میں اہل حدیث انجمنوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی دنوں انجمن اہل حدیث جہلم قائم کی گئی اور کسی پیمانے پر ایک باقاعدہ نظم کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس انجمن کے پہلے صدر ایک بزرگ میاں عبدالرحمٰن کو اور سیکرٹری بابو عبدالرشید کو بنایا گیا تھا۔ انجمن کے عہدے داروں کا دوسری دفعہ انتخاب ہوا تو صدر صوفی محمد حسین صراف کو اور سیکرٹری منشی کرم داد کو منتخب کیا گیا۔ اب جہلم میں اس انجمن کے تحت سالانہ تبلیغی جلسوں کا انعقاد شروع ہوگیا۔ ان جلسوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی اور دیگر بہت سے علمائے کرام شرکت فرماتے تھے۔ انجمن اہل حدیث جہلم کا ایک سالانہ جلسہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اس جلسے میں ''فرائض اہل حدیث'' کے عنوان سے تحریری خطبہ پڑھا تھا جو ''خطبات سلمان'' میں چھپ چکا ہے۔ انجمن اہل حدیث جہلم کا یہ دسواں سالانہ جلسہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے اس انجمن کے نو سالانہ جلسے منعقد ہو چکے تھے۔ اگر انجمن کا سالانہ جلسہ ہر سال منعقد ہوتا رہا ہو تو جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ ۱۹۱۸ء سے شروع ہوا تھا اور اس زمانے میں جہلم اور اس کے گردونواح میں اہل حدیث اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور شہر اور علاقے میں اپنا اثر رکھتے تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ جہلم کی مسجد اہل حدیث کا انتظام ایک بزرگ حاجی نورالدین کے سپرد ہوا۔

ان کے بعد یہ ذمہ داری ایک اور شخصیت حاجی امام الدین نے سنبھالی۔ انجمن کے فیصلے سے مسجد کے خطیب مولانا کبیر احمد دہلوی کو مقرر کیا گیا۔ مولانا کبیر احمد دہلوی کے بعد بہ طور خطیب مولانا عبدالحق امرتسری کا تقرر ہوا۔ مولانا عبدالحق امرتسری کا تعلق سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے تھا اور انگریزی حکومت جماعت مجاہدین سے شدید عداوت رکھتی تھی، جس کے نتیجے میں حکومت نے مولانا عبدالحق امرتسری کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا اور وہ جیل ہی میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد منصب خطابت پر مولانا عبدالغفور (ساکن خورد ضلع جہلم) کو فائز کیا گیا۔ ان کے بعد مولانا عبدالجبار جہلمی کو خطیب بنایا تا۔ انھوں نے بے حد تبلیغی خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ اس کے بعد پونچھ کے مولانا عبدالحق کو ان کی جگہ لایا گیا۔ مولانا عبدالحق کے بعد مولانا عبدالرحمٰن دینا نگری آئے اور ان کے بعد مولانا عبدالمجید دینا نگری نے مسجد کی خطابت و امامت کا فریضہ بھی انجام دیا اور چھوٹے سے پیمانے پر دینی مدرسہ بھی قائم کیا، جس میں ان کے علاوہ بعض دیگر اہل علم بھی تدریسی کام کرتے رہے۔ مولانا عبدالمجید دینا نگری نہایت متحمل مزاج، مہمان نواز اور عالی کردار بزرگ تھے۔ وہ طویل عرصے تک اس شہر میں اقامت گزیں رہے اور انھوں نے بہت خدمات سرانجام دیں۔

انجمن اہل حدیث کے اصرار پر ۱۹۶۲ء میں مستقل طور سے حافظ عبدالغفور جہلم آ گئے اور اس کے بعد جہلمی کی نسبت ان کے نام کا جزو لاینفک قرار پا گئی اور یہی نسبت قبر میں ان کے ساتھ گئی۔

یہاں یہ بتانا بھی شاید ضروری ہے کہ حضرت میاں سید نذیر احمد دہلویؒ کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں جہلم کے دو علمائے دین کے اسمائے گرامی درج ہیں، وہ ہیں مولانا حافظ قطب الدین اور مولانا عظیم اللہ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان دونوں حضرات کا تعلق سکونت شہر جہلم سے تھا یا ضلع جہلم کے کسی گاؤں یا قصبے سے۔ یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ انھوں نے حضرت میاں صاحب سے کس دور میں تعلیم حاصل کی، کب ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ یعنی کوشش کے باوجود ان کے کسی قسم کے حالات کا علم نہ ہو سکا۔

جہلم میں مستقل قیام: بات حافظ عبدالغفور کے بارے میں ہو رہی تھی اور یہاں تک پہنچی تھی کہ انجمن اہل حدیث جہلم کے اصرار پر ۱۹۶۲ء میں وہ مستقل طور سے جہلم آ گئے اور اس کے بعد جہلمی کی نسبت ان کے نام کا جزوِ لاینفک قرار پا گئی۔ اب آئندہ سطور میں ان کا ذکر حافظ عبدالغفور جہلمی کے نام سے کیا جائے گا کہ ان کی اصل شناخت یہی ہے۔ دوسری شناختیں اپنی مدت پوری کر کے ختم ہو گئیں۔

خدمت دین کے پانچ حصے: جہلم میں مستقل قیام کے بعد حافظ عبدالغفور نے فوری طور پر جن دینی خدمات کا آغاز کیا انھیں ہم پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

☆.....خطابت ☆.....روزانہ کا درسِ قرآن ☆.....تدریس

☆.....وعظ وتبلیغ ☆.....نشرواشاعت کتب

خدمت دین کے یہ پانچوں حصے نہایت اہمیت کے حامل ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خدمت دین انہی کا نام ہے۔ان کے علاوہ ایک عالم دین کیلئے خدمت دین کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے بزرگانِ دین نے بے حد اہتمام سے یہ پانچوں کام کیے ہیں۔ بلکہ صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ انہوں نے ہمیشہ انہی اقسامِ خمسہ کے دائرے میں اپنے آپ کو محصور رکھا ہے۔

خطابت: خطابت کو یہاں صرف خطبہ جمعہ میں محدود کر لیجیے تو یہ بہت بڑی خدمت ہے جو خطیب ہر جمعے بالالتزام سرانجام دیتا ہے۔ سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا دھوپ، آندھی ہو یا صاف موسم اس نے بہرصورت جمعہ پڑھانا اور خطبہ دینا ہے۔اگر یہ خدمت نیک نیتی سے انجام دی جارہی ہے تو دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں اس کے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ خطبہ جمعہ خطیب کی مستقل سٹیج ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگ پانچ وقت کی نماز ادا کرنے میں تساہل کا مظاہرہ کر دیتے ہیں، لیکن نمازِ جمعہ کے لیے مسجد میں اوّل وقت آنے کی کوشش کرتے اور خطیب کا خطبہ پورے غور سے سنتے ہیں۔اس کا اثر بے شک فوری طور پر نہ ہوتا ہو لیکن اس کے فوائد کسی نہ کسی انداز میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ بے عمل لوگ بھی بسا اوقات خطیب کی باتوں کے حوالے دیتے اور گھروں میں جاکر بتاتے ہیں کہ آج مولوی صاحب نے یہ یہ باتیں بیان کیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ انسانی ضمیر زندہ ہے اور وہ فطری طور پر قبولِ حق کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ بے شک کسی وجہ سے وہ آمادۂ عمل نہ ہو سکے، لیکن اس کے اندر ایک طاقت ضرور ہے جو اسے برائی سے روکتی اور امورِ خیر پر عمل کی ترغیب دیتی ہے۔ پھر ایسا بھی بارہا ہوا کہ وہی شخص عامل بھی ہوا اور لوگوں کو عمل بالمعروف کی ترغیب دینے والا بھی ہوا۔

ہمارے ممدوح حافظ عبدالغفور جہلمی بہت اچھے خطیب تھے اور ان کے خطبہ جمعہ میں مرد بھی خاصی تعداد میں آتے تھے اور عورتیں بھی۔ یقیناً ان کے خطبات سن کر بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدلی ہوں گی اور وہ برائی سے تائب ہو کر نیکی کی طرف راغب ہوئے ہوں گے۔ کسی نے ماپ تول کی کمی بیشی سے توبہ کی ہوگی، کسی نے

جھوٹ بولنے اور لوگوں کو دھوکا دینے سے اپنے آپ کو بچایا ہوگا، کسی نے ان کے خطبے سن کر نماز روزے کی پابندی کو اپنا معمول بنایا ہوگا، کسی نے پڑوسیوں کو تنگ کرنے کا سلسلہ ترک کیا ہوگا اور کسی نے صلہ رحمی اور رشتے داروں سے حسن سلوک کا عزم کیا ہوگا۔ اعمال خیر کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست کے کسی حصے پر تو کسی نے عمل کیا ہوگا اور اس کا اجر جہاں عمل کرنے والے کو ملا، وہاں منبر پر کھڑے ہو کر اس کی ترغیب دینے والے کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوا۔ یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو خطابت کی صورت میں وہ کرتے رہے اور اسلامی معاشرے کا ایک طبقہ اس سے اثر پذیر ہوا۔

روزانہ درسِ قرآن: قرآنِ مجید وہ صحیفۂ پُرنور ہے جو بارگاہِ الٰہی سے جبریل امین کی وساطت سے قلب پیغمبر (ﷺ) پر عربی زبان میں نازل ہوا۔ یہ دنیائے مذاہب کی واحد الہامی اور منزل من اللہ کتاب ہے جو اپنے عہد نزول (چودہ سو سال) سے پوری طرح محفوظ ہے، اس کے کسی حرف اور کسی لفظ میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے ہو چکے اور لاتعداد شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کتابِ ہدیٰ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ مسلمان اصحابِ علم کے علاوہ غیر مسلم اہل علم نے بھی اسے لائق اعتنا گردانا اور اس کے معانی و مطالب کی وضاحت کی۔ اگرچہ قرآن کے بارے میں بہت سے غیر مسلموں کی نیتوں میں فتور ہے اور وہ اس سے مخالفانہ پہلو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں تاہم وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کیلئے کوشاں تو ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب کی جن کتابوں کو الہامی قرار دیا جاتا ہے، ان میں سے کوئی مکمل کتاب شروع سے آخر تک کسی کو لفظ بہ لفظ یاد نہیں ہے اور یاد ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کے برعکس قرآن لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر مسلمان اسے یاد کر سکتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی حفاظِ قرآن موجود ہیں۔ اور ہر جگہ بے حد شوق اور انتہائی دلجمعی کے ساتھ قرآن کو سنا اور پڑھا جاتا ہے۔

نمازِ فجر کے بعد مساجد میں قرآنِ مجید کے درس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دور نہ جایئے، ماضی قریب کے صرف پنجابی اہل حدیث علمائے کرام کو لیجئے، ان میں متعدد حضرات باقاعدہ درس قرآن دیتے اور لوگ ان کے دروس میں حاضر ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کے شروع سے آخر تک درس قرآن کے کئی کئی دور ہوئے۔ ان میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، حکیم عبداللہ (روڑی والے) اور دیگر متعدد حضرات نے روزانہ کے درسِ قرآن کو اپنا معمول قرار دیے رکھا۔ حافظ عبدالغفور جہلمی مرحوم کا بھی یہ

معمول رہا کہ انھوں نے جہلم کو اپنا مستقل مسکن قرار دیتے ہی جامع مسجد اہل حدیث میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اہل حدیث اور غیر اہل حدیث ان کے درس میں آتے اور قرآنِ مجید کے احکام و اوامر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن کا پڑھنا، پڑھانا، سننا سنانا نہایت برکت کا باعث ہے۔ اگر قرآن کے معانی کو سمجھ کر اس کی تلاوت کی جائے تو بہت سی نئی سے نئی چیزیں سامنے آتی ہیں اور معلومات کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تدریس: جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا حافظ عبدالغفور جہلمی منجھے ہوئے مدرس تھے اور متعدد مقامات پر خدمت تدریس سرانجام دے چکے تھے۔ آئندہ بھی ان کے یہی عزائم تھے اور یہی کام ان کا اصل مرکز فکر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جہلم میں ایک مثالی دینی درس گاہ قائم کی جائے۔ لیکن اس کے لیے وسائل کو بروئے کار لانا ضروری تھا۔ جس قدر ارادہ نیک اور اہم تھا، اسی قدر اس کی تکمیل کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس قسم کا بڑا کام صرف ارادے سے تکمیل کی منزل طے نہیں کر سکتا۔ ارادے کے ساتھ عزم و ہمت اور سرمایہ کی فراہمی بنیادی عنصر ہے۔

اسی دوران میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھیؒ جہلم تشریف لائے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ شیخ ممدوح اصلاً صوبہ سندھ کے رہنے والے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور عالم دین تھے۔ سعودی عرب کے شیوخ و علما سے ان کے گہرے مراسم تھے اور ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے سب حضرات ان کو تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حافظ عبدالغفور جہلمی نے ان سے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اس منصوبے کی تفصیل بیان کی۔ نیز بتایا کہ اس علاقے میں اس قسم کے دارالعلوم کی سخت ضرورت ہے جو مسلک سلف کی ترویج اور اہل حدیث کے اصول و ضوابط کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہو۔ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے منصوبے کی تفصیل اور اس کی ضرورت و اہمیت سے مطلع کر حافظ صاحب سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس کی تکمیل کے لیے وسائل کی فراہمی کا بھی وعدہ فرمایا اور جامعہ العلوم الأثریہ اس کا نام تجویز ہوا۔ شیخ ممدوح نے عیدالفطر جہلم میں پڑھائی اور خطبے میں جامعہ اثریہ سے متعلق پوری وضاحت سے اظہارِ خیال فرمایا اور اس باب میں مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ چنانچہ شہر میں نہایت مناسب موقعے پر واقع اسی عیدگاہ اہل حدیث کو اس عظیم مقصد کیلئے منتخب کر لیا گیا دو ایکڑ زمین خریدی گئی اور جامعہ اثریہ کی تعمیر و تاسیس کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا۔ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے طویل علالت کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۹۹ء، ۸ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ کو مدینہ منورہ میں جمعرات کے روز اذانِ عصر کے وقت وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۳ برس تھی۔

سنگ بنیاد: یہ بہت بڑا منصوبہ تھا اور بہت بڑی ہمت کا طالب.....! فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ علوم اثریہ کا سنگ بنیاد بیت اللہ شریف کے لائق احترام امام شیخ محمد بن عبداللہ بن سبیّل سے رکھوایا جائے۔ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے یہ اہم ذمہ داری قبول فرمائی کہ وہ حضرت امام صاحب سے عرض کریں گے کہ وہ جہلم تشریف لائیں اور جامعہ علوم اثریہ کا سنگ بنیاد رکھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تشریف آوری کا معاملہ بہت اہم تھا اور اس کے لیے وقت درکار تھا۔ سکیورٹی کے انتظامات کا بھی مسئلہ تھا۔ بہرحال ۲۷۔ ستمبر ۱۹۷۹ء کو پاکستان تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔ حافظ عبدالغفور نے شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی اور اپنے دیگر رفقائے کرام کے مشورے سے ۲۸، ۲۹ ستمبر کو جہلم میں ایک عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ پروگرام یہ طے پایا کہ ۲۷۔ ستمبر کو حضرت امام کعبہ اپنے رفقائے عالی مقام کے ساتھ راولپنڈی ائیر پورٹ پر اتریں گے تو اسی دن شام کو انھیں جہلم لایا جائے گا۔ ۲۸۔ ستمبر کو وہ جہلم میں خطبہ جمعۃ المبارک ارشاد فرمائیں گے۔ چنانچہ اس پروگرام پر عمل کیا گیا۔ اس موقعے پر پاکستان کے جو علمائے کرام جہلم تشریف لائے، ان میں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا عبدالقادر روپڑی، مولانا محمد صدیق، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔

سنگ بنیاد اس طرح رکھا گیا کہ حافظ عبدالغفور صاحب نے اسے شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی کو پکڑایا اور شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے اسے امام کعبہ شیخ محمد بن عبداللہ سبیّل کے بابرکت ہاتھوں سے متعلقہ مقام پر نصب کرایا۔ یہ نہایت مسرت انگیز موقع تھا۔ امام صاحب نے اس موقع پر بھی خطاب فرمایا۔

جہلم کی تاریخ کا یہ بہت بڑا اجتماع تھا۔ اس میں جہلم شہر کے لوگوں کے علاوہ جہلم سے باہر کے بھی بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ مقامی انتظامیہ نے اس دن سکولوں اور سرکاری دفاتر میں چھٹی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں مرحوم قاضی محمد اسلم سیف، بشیر انصاری نے بہت محنت کی، لوگوں سے رابطہ کرنے، ان کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے اور اشتہار وغیرہ شائع کرانے میں انھوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ اس قسم کے مواقع پر وہ بے حد ہمت سے کام لیتے تھے اور بڑی جدوجہد کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نہ خود آرام کرتے تھے، نہ اپنے ساتھیوں کو آرام کرنے دیتے تھے۔ ہر وقت کام میں جتے رہتے تھے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

جامعہ اثریہ جہلم میں درس وتدریس کے سلسلے کی ضروری تفصیلات آئندہ سطور میں بیان کی جائیں گی۔

وعظ وتبلیغ: حافظ عبدالغفور نے جہلم کو اپنا مقام سکونت قرار دینے کے بعد یہاں جو چوتھا کام شروع کیا، وہ تھا وعظ

وتبلیغ کا کام۔ وعظ وتبلیغ کا مطلب یہی نہیں کہ کسی شہر یا دیہات میں سٹیج لگا کر وعظ کیا جائے۔ بلکہ وعظ وتبلیغ کا مقصد ہے کہ انفرادی طور پر لوگوں سے مل کر ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ ان کے سامنے حق کی صراحت کی جائے اور باطل سے روکنے کی سعی کی جائے۔ اگر یہ ہو گیا تو کوئی مانے یا نہ مانے واعظ اور مبلغ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ حافظ عبدالغفور نے اس شہر کے لوگوں میں ہر پہلو سے تبلیغ کی اور ہر اسلوب سے ان پر حق واضح کیا۔ اور نہایت نرمی اور میٹھے طریقے سے ان پر اللہ کے دین کی صداقت اور حقانیت ثابت کرنے کا اہتمام کیا۔ وہ چلتے پھرتے مبلغ اور واعظ تھے اور ان کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ کی بنا پر لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس قسم کے نرم خو اور خوش کلام مبلغ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

نشر واشاعت کتب: حافظ عبدالغفور کا پانچواں منصوبہ نشر واشاعت کتب کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل اور سیرت پیغمبر (ﷺ) کے سلسلے کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ بے شک یہ نہایت اہم کام ہے اور ہر دور میں اس کی اہمیت کو مانا گیا اور اس پر عمل کیا گیا ہے۔ تفسیر وحدیث کے بنیادی موضوع کی کتابیں صدیوں پیشتر عربی میں لکھی گئیں۔ رجالِ حدیث ورواۃ سے متعلق کتابیں بھی عربی میں معرضِ تصنیف میں لائی گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان موضوعات کے علما وماہرین کی زبان عربی تھی اور عربی ہی میں انھوں نے وہ عظیم الشان ذخیرہ تیار کر دیا جس کی کوئی مثال دنیا میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

عربی کے علاوہ برصغیر کے علما ومصنفین نے فارسی کو مرکز التفاف قرار دیا، اس لیے کہ اس خطۂ ارض میں فارسی کا چلن تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا اور بالکل صحیح فیصلہ کیا جو حالات کے عین مطابق تھا کہ اسلامی لٹریچر کو فارسی میں منتقل کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ پھر زمانے نے کروٹ لی اور برصغیر کی سرزمین اردو سے آشنا ہوئی اور یہ آشنائی یہاں تک بڑھی کہ اردو زبان ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر گئی اور اس کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہونے لگا۔ اردو بولنے والے بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تبلیغ کا شوق رکھنے والوں نے اردو کو اظہارِ مدعا کا ذریعہ قرار دے لیا۔ اس زبان میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا اور عربی کتابوں کے ترجمے کے لیے بھی اس کا انتخاب کیا گیا۔ ہمارے ممدوح حافظ عبدالغفور جہلمی نے بھی اس طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور عربی کی ان کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا عزم کیا جو عوام کے لیے بھی فائدہ مند ہوں اور خواص کے لیے بھی۔ چنانچہ اس کے لیے ان کی پہلی نگاہ انتخاب مختصر سیرۃ الرسول ﷺ پر

پڑی جو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کے فرزند گرامی شیخ عبداللہؒ کی نہایت عمدہ عربی تصنیف ہے۔ یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ نبی ﷺ کی سیرت طیبہ بھی ہے، اس میں خلفائے راشدین کے علاوہ بعض صحابہ کرام کے واقعات بھی ہیں اور اس میں ضروری مسائل بھی ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کی اس عظیم الشان کتاب کی طباعت وغیرہ کے تمام مصارف شیخ ابراہیم بن علی ناصر نے برداشت کیے۔ شیخ ممدوح کے لیے اس کی حیثیت صدقہ جاریہ کی ہے۔ ان شاء اللہ یہ کتاب ان کیلئے ذریعہ نجات ثابت ہوگی۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ ہمارے پیش نگاہ ہے جو اہل حدیث کے ممتاز عالم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسحاق حسینوی نے کیا۔ ترجمے کی زبان نہایت صاف ہے۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم جہاں بہت بڑے مدرس تھے، وہاں ترجمہ وتصنیف کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ترجمے کے بعد اس کی تصحیح اور پروف خوانی کا فریضہ مرحوم مولانا اکرام اللہ ساجد کیلانی نے انجام دیا۔ کتاب آٹھ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی ہے جو متعدد مرتبہ ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ افسوس ہے مطبوعہ شکل میں یہ کتاب حافظ عبدالغفور صاحب نہ دیکھ سکے۔ اسی طرح ایک اور قابل ذکر کتاب ''غاية الامانی فی الرد علی النبهانی'' ہے جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کا اردو ترجمہ ۶۰۷ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور دوسری کا ۶۴۶ صفحات میں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ''انوارِ رحمانی'' کے نام سے حافظ عبدالغفور صاحب جہلمی نے کرایا۔ عربی کتاب کے مصنف علامہ ابوالمعالی محمود شکری الآلوسی ہیں اور مترجم ہیں مولانا ابوبکر صدیق سلفی۔ اس کی کتابت حافظ صاحب کی زندگی میں ہوگئی تھی۔ لیکن طباعت حافظ صاحب کی وفات کے بعد ہوئی۔

یہ دونوں اہم کتابیں جامعہ علومِ اثریہ جہلم کی طرف سے شائع کی گئیں اور ان کتابوں کو قبولیت عامہ کا درجہ ملا۔ گزارش کا مطلب یہ ہے کہ حافظ صاحب ممدوح وقت کے تیوروں اور حالات کی رفتار سے خوب آگاہ تھے۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ جہاں یہ دور درس وتدریس میں سرگرم رہنے کا تقاضا کرتا ہے، وہاں یہ تحریر ونگارش کا بھی متقاضی ہے اور قلم وقرطاس سے کام لینے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس طرف توجہ دی اور اپنی زندگی میں ان کتابوں کی نشر واشاعت اور ان کے تراجم کیلئے کوشاں ہوئے جو ان کے نزدیک اسلاف کی روایات کو اجاگر کرنے اور قرآن وحدیث کے احکام کو لوگوں تک پہنچانے کا باعث بن سکتی تھیں۔ انھوں نے ذاتی طور پر اس بنیادی کام کا آغاز کیا جو اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ یہ ان کے حسن نیت کی علامت اور ان کے خلوصِ قلب کا بین ثبوت ہے۔ (جاری ہے)